قیصر تمکین

ایک کہانی، گنگاجمنی

۱

"پریتم آن ملو ..."

"لاحول ولا قوّۃ۔ ابے کم بخت کون ہے؟ پریتم پریتم لگائے ہے۔"

یا ... آن ... ملو... "

"ابے چپ الّو کے پٹّھے۔ ابھی آن ملتا ہوں تیری امّاں سے۔" مرزا بیداربخت اب واقعی زور سے غصّے میں چلّائے۔ مگر جواب میں بالکل گھر کے دروازے پر ہی کسی نے ان کو چڑھانے کے لئے تان لگائی، "یان آن ملو۔" اب مرزا بیداربخت سے بالکل ضبط نہ ہو سکا۔ چاندی کی موٹھ والی ڈیڑھ گز لمبی لاٹھی اٹھائی۔ پیروں میں گرگابیاں ڈالیں اور باہر کی طرف چلے۔ بیوی نے راستہ روکا اور بیٹی نے ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹنے کی کوشش کی۔ مگر مرزا کا غصّہ اپنے شباب پر تھا۔ دونوں کو ایک طرف ڈھکیل کر لاٹھی ٹھونکتے یہ جا، وہ جا۔

باہر نکل کر انھوں نے دیکھا اور بڑی بانکی سے لاٹھی ٹھونکی۔

چاندی والی گلی میں حسبِ معمول صبح کا شور شرابہ دوپہر سے گلے مِل رہا تھا۔ قلعی گر برتنوں پر رانگے کے چمکتے چَھلّوں سے قلعی کرنے میں مصروف تھے۔ نیچی نیچی چھتوں والی اندھیری دوکانوں میں پتنگ بنانے والے اپنے فن کو آخری سنبھالا دینے کی کوشش میں مصروف تھے۔ گلی کے برابر محلسرا کی لکھوری اینٹوں کی دیوار پر کھونٹیاں اور چرخیاں لگا کر کنکوّوں کے لئے ڈور اور مانجھا بنایا جا رہا تھا۔ میونسپلٹی کے موٹی دھار کے بمبے پر حافظ بشیر کی بیوہ ترکاریوں کا ڈھیر لگائے شلجم دھو رہی تھی۔ بانکے لال کے "کریانہ اسٹور" پر اُدھار آٹا دال مانگنے والی سیّدانیاں برقعے اوڑھے، نقاب اُلٹے، بھاری بھاری کولہوں پر ریں ریں کرتے اور ناک بہاتے بچّے ٹِکائے طرح طرح کے بہانے بنا رہی تھیں۔ ان میں سے بعض کے ہاتھوں میں مہین تار جیسے چاندی کے چَھلّے، ایک آدھ سونے کی بالی، ناک کی کیل یا کسی ننّھی بچّی کی چھوٹی سی چوڑی بھی تھی جس کو رہن رکھ کر وہ جَو ملا آٹا یا دھان

ملے کاکُن جیسے چاول لے جانے کی فکر میں تھیں۔ یہ چاندی سونے کے چَھلّے محض نام کے لئے رہن رکھے جاتے کیونکہ ایک بار اگر کوئی چیز بانکے لال کے "کریانہ" اسٹور پر رہن ہو جاتی تو پھر اس کو واپس چھڑانے کا کبھی کوئی سوال ہی نہ اُٹھتا۔ برقعے والیاں خوشامد کرکے آٹا دال گھر لے جاتیں جہاں گیلی لکڑیاں پھونک کر اُن کی آنکھیں سوج جاتیں، محض اس ڈر سے وہ اس عذاب میں مبتلا رہتیں کہ چراغ جلے جب روزی کمانے والا گھر پہنچے تو بھوکا نہ سو سکے۔

گلی کی چاؤں چاؤں میں نبی بخش زرکوب چاندی کا ورق کوٹے جارہا تھا، جس سے ہمیشہ ایک مخصوص زندگی بخش آہنگ برپا رہتا۔ افتخار کَسگر، عارف قلعی گر، اور عبداللہ شیرینی فروش کی دوکانوں کے آگے پہنچ کر اس گلی کا روپ بدلنے لگتا۔ بڑی بڑی کُھلی اور دو تین دروں والی دوکانوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا، جن میں چکن کامدانی بنانے والوں، بزازوں اور انگریزی دوائیں بیچنے والوں اور پھر تانبے پیتل کے برتنوں کا کاروبار کرنے والوں کی دوکانیں آتیں، اور ان کے بعد گلی کا ایک سرا کچھ اس طرح شہر کی بڑی سڑک کے چوراہے پر مل جاتا کہ منظر بدلنے کا اِحساس بھی نہ ہوتا۔

چوراہے پر موٹروں، یکّوں، تانگوں، رکشوں اور سائیکل سواروں کے ہجوم میں پتہ بھی نہ چلتا کہ اسی سڑک کے متوازی ایک نیم روشن، سیلی ہوئی، ٹھنڈی ٹھنڈی چاندی والی گلی بھی ہے جس کے وسط میں عالمِ دوراں اور فاضلِ اجل مرزا بیداربخت کا غریب خانہ بھی ہے جہاں وہ عصرِ حاضر کا تاریخ ساز صحیفہ رقم فرمانے میں مصروف ہیں اور اندر گھر میں ان کی بیگم اور بیٹی پرانے دنوں کے کامدانی کے دوپٹّوں سے چاندی کے تار کھینچ کھینچ کر چولہا گرم کرنے کی کسی نئی جدّوجہد میں مصروف ہیں۔

مرزا بیداربخت نے شَرر بار نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھا۔ ان کو "پریتم آن ملو" کی دعوت دینے والا تو کوئی نہ دکھائی دیا، ہاں افتخار کَسگر اور نبی بخش زرکوب کی دوکانوں سے پرے وہ بڑا لنگوری بندر خوخیاتا نظر آیا جس کے بارے میں آج کل گلی میں طرح طرح کے قصّے مشہور تھے۔ بندر کا منہ خاکی رنگ کا تھا۔ اس کی دُم بے تحاشہ لمبی تھی۔ یہ بندر گلی کے سُناروں کے لڑکوں نے پالا تھا اور اس کا خاص کام میاں لوگوں کی پگڑی اُچھالنا تھا۔ ابھی کوئی ہفتہ دس دن پہلے اس نے مولوی حَقّی کی بڑی بری گت بنائی تھی۔

مولوی حَقّی اپنی گھنی داڑھی مونچھوں کے بیچ میں ایک پائپ کھونسے رہتے تھے۔ وہ مُحکمہ اطّلاعات میں اخبارات پڑھنے، ان کے تراشے نکال کر اپنے تبصروں کے ساتھ متعلّقہ شُعبوں اور افسروں کو بھیجنے کی خدمت پر مامور تھے۔ ان کی حیثیت اَپر ڈویژن کلرک کی تھی، مگر وہ اپنے کو ادبِ اسلامی کا دانشور بھی کہلاتے۔ چنانچہ ہر وقت منہ میں پائپ دبائے رہتے۔ یہ پائپ عام طور پر بجھا ہی رہتا، کیونکہ کثیرالعیالی کی بنا پر وہ مہینے میں صرف ایک ہی ڈبّہ اپنی جماعت کے رفیق ٹیڈی ملّا کی دوکان سے حاصل کرنے کی اِستطاعت رکھتے تھے۔ اس ڈبّے کو وہ بہت کفایت سے استعمال کرتے۔ وہ سائیکل ہاتھ میں پکڑے پکڑے گلی طے کرتے اور سُناروں کے علاقے میں داخل ہوتے ہی اس پر بیٹھتے، اور ریاستی سکرٹیریٹ

کی طرف روانہ ہوتے۔ لنگوری بندر نے کئی بار دور ہی دور سے مولوی حَقّی کو دھمکایا اور چڑھایا بھی، مگر وہ اپنی آبرو بچا کر نکال لے جانے میں کامیاب ہوگئے۔ حال ہی میں بندر نے مولوی حَقّی کی نقل میں ایک لال گاجر منھ میں لگالی۔ سُناروں کے لڑکے خوب ہنسے، اور طرح طرح کے آوازے کَسے، جن کا مطلب تو مولوی حَقّی خوب سمجھتے تھے، مگر بظاہر کوئی ایسی بات نہ تھی جس کی بنا پر وہ کوئی اعتراض کرسکتے۔

مولوی حقّی نے پائپ منھ میں لگایا اور سائیکل پر سوار ہونے کو ہی تھے کہ لنگوری بندر نے اُچھل کر ان پر حملہ کیا اور معلوم نہیں کس مَہارت سے ان کا پائپ چھین کر الگ کھڑا ہوگیا، اور مولوی حَقّی ہی کی طرح پائپ منھ میں لگا کر اُنھیں کے حلقے کا چھوٹا موٹا دانشور نظر آنے لگا۔ مولوی حَقّی نے کچھ کہنا چاہا تو بندر نے اپنی دُم اس طرح گھمائی کہ مولوی حَقّی کے ہاتھ سے سائیکل چُھٹ گئی اور وہ گھبرا کر ایک طرف ہو گئے۔ سائیکل کی کئی تیلیاں ٹوٹ گئیں۔

دو ایک قلعی گر، کنکوّے بنانے والے اور کَسگر جلدی سے آئے اور مولوی حَقّی کو دلاسا دینے لگے؛ "آجی چھوڑیے مولوی صاب۔ یہ لیجیے، سائیکل سنبھالیے۔ آجی اپنی راہ نکلیے۔ بےفائدہ بےفضول میں اپنی بےعزّتی خراب کرنے سے کیا فا ئدہ۔"

مولوی حَقّی اپنا بایاں گھٹنا جَھاڑتے غم وغصّے کے احساس کے ساتھ سائیکل پکڑے پکڑے پیدل ہی دفتر چل دئیے۔

یہ واقعہ مرزا بیداربخت کے گھر میں کئی عورتوں کا موضوعِ گفتگو رہا تھا۔ ان کو یہ معلوم تھا کہ اس لنگوری بندر کی وجہ سے شریفوں کا اس گلی سے گزرنا ہی مشکل ہوگیا تھا۔ یہ بندر روز ہی کسی نہ کسی میاں بھائی کی گت بنا ڈالتا۔ خاص طور پر برقعےوالیوں اور پَردےدار عورتوں پر اس طرح جَھپٹتا کہ اچّھے اچّھے گھرانوں کی سیدزادیاں بےپردہ ہو کر بھاگنے اور گڑگڑانے کے سوا کچھ نہ کرپاتیں۔

اس دن جب کسی نے بےفکری میں "پریتم آن ملو" کی راگنی آلاپی تو مرزا خفا ہو کر باہر نکل آئے۔ ان کو "پریتم آن ملو" کی دعوت دینے والا نظر نہ آیا، ہاں لنگوری بندر ان کو دیکھ کر ضرور خوخیانے لگا۔ مرزا کا حُلیہ بھی کچھ ایسا تھا کہ ہر شخص کی نظر ان پر پڑ رہی تھی۔ بندر نے ان کو دھمکانے کے لئے جو خوخیانا شروع کیا تو مرزا اکڑ کر آگے بڑھکر کھڑے ہو گئے۔ بندر نے ان کا چیلنج قبول کر لیا اور گُھما کر اپنی دُم سونٹے کی طرح ماری۔ مرزا بیداربخت اُچھل کر ایک طرف ہوگئے اور اپنی جوانی کے زمانے کا ہاتھ دکھاتے ہوئے گُھما کر جو لاٹھی ماری تو بندر کا دماغ شَل ہوگیا۔ وہ بیہوش ہو کر گر پڑا اور اس کی ناک سے خون کی دھاریں نکلنے لگیں۔

"ہائے رام گجب ہوئی گوا،" کئی لوگوں نے سنسنی خیز لہجوں میں آوازیں لگائیں۔ لالہ دھونی چند دھوتی سنبھالتے آگے بڑھے، مگر تب تک مرزا بیداربخت نے دو ہاتھ اور جَڑ دیے۔ بندر کا بھیجا پَھٹ گیا اور وہ وہیں تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔

"ہائی رے۔ دیّا رے۔ کا کر ڈالیو مرجا جی ..." گلی کی کَھٹک عورتیں سنّاٹے میں آگئیں۔

"رام، رام، رام۔ ہتیا ہوئے گئی۔ ہنومان۔ ہتیا ہوئے گئی۔" صَرّافوں کے شیطان لڑکے وحشت زدہ لہجوں میں چلّانے چیخنے لگے۔ پوری گلی میں سَنسنی پھیل گئی۔ "ارے مرزا صاحب، کیا غضب کر دیا۔" افتخار کَسکر، عارف قلعی گر اور رام لال کُمہار مرزا کو ایک طرف کھینچنے لگے۔ مگر تب تک مرزا بیداربخت غصّے میں بے قابو ہو چکے تھے، اور فحش گالیاں بَکنے لگے تھے۔ "اب کے اگر کوئی مادرچود حرامی پَن کرے گا تو سالے کے چوتڑوں میں یہی لاٹھی نہ گھسیڑدوں تو میں بھی اصل مغل بچّہ نہیں ..."

یہ مغلیہ آن بان دیکھ کر مانی لال کے لڑکے نے "ہر ہر مَہادیو" کا نَعرہ لگا دیا۔ جواب میں برابر بڑھتے ہوئے مَجمعے نے "جَے ہنومان کی" اور "بھارت ماتا کی جَے" کے نعرے لگائے۔

سُناروں کے لڑکوں نے داڑھی والوں، چوگوشیہ ٹوپی والوں، اور تہمدوپاجامہ پوش لوگوں کی گُھونسوں، لاتوں، اور مُکّوں سے تواضع شروع کردی۔ بعض ویر جوانوں نے پَلنگ کے پایوں اور پَٹّیوں سے بھی میاں لوگوں کی مَرمّت میں دلچسپی لی۔ تب تک پوری گلی میں دَھڑا دھڑ دوکانیں بند ہونے لگیں۔

علی جانی کربلائی کے تعزیے، ضَریح اور عَلم باہر رکھے تھے۔ اس نے ڈر کے مارے گھبرا کر ان کو دوکان کے اندر رکھنا شروع کیا تو سیتارام کھرے اور مانی لال کے لڑکے ان پر گوبر اور جوتے پھینکنے لگے۔ علی جانی کربلائی کا جوشِ ایمان جلال پر آگیا، اور اس نے "یا علی" کہہ کر دُرگا تَنبولی کے نوجوان بیٹے کے سینے میں قرولی بھونک دی۔ سولہ سترہ برس کے خوب رُو جوان کا خون دیکھ کر سیوا دَل کے نَوبیوکوں کو جوش آگیا، اور بالکل جادوئی طریقے پر ہر طرف سے چاقو چُھریاں نکل آئیں جو حال ہی میں پردیش کانگرس کے پردھان شری اَمرت لال گنتھے نے نوجوانوں کو پاکستانی جاسوسوں کا مقابلہ کرنے کے لئے بانٹی تھیں۔

چُھری چاقو کے استعمال سے فَساد پورے رنگ پر آگیا۔ پَنّا لال کے پُل پر بنی ہوئی پولس چوکی پر تعینات پی۔ اے۔ سی۔ کے بہادر جوان ایک ہی ریلے میں گُھس آئے، اور اُنھوں نے میاں جی لوگوں کے پاجامے اور تہمدیں اُتار اُتار کر اچّھی طرح دُھنائی شروع کردی۔ میاں جی لوگوں کے حُلیے اس طرح بگڑ گئے کہ ان کی مائیں بھی ان کو نہ پہچان سکتیں۔ پی۔ اے۔ سی۔ کے بہادر جوانوں کو دیکھ کر رام لال کے لڑکوں، کھرے بابو کے چیلوں، اور نارنگ جی کے نویوکوں کو اطمینان ہوا۔ انھوں نے مٹّی کے تیل کے ڈبّے لا لا کر میاں لوگوں کی دوکانوں پر چھڑکنا شروع کیا۔ تین بجتے بجتے چاندی والی گلی کا ایک حصّہ جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ تب تک آکاش وانی نے اپنی قومی خبروں میں اعلان کردیا کہ "خانپور شہر میں پاکستانی گُھس بیٹھیوں نے گڑبَڑ کی جس سے دو گھس بیٹھئیے مارے گئے۔"

دوسرے دن اسی جَلی اور جُھلسی ہوئی چاندی والی گلی میں ایک بڑا سا لال کپڑا بچھا تھا جس پر لنگور کی لاش پڑی تھی۔ اس کے آس پاس کھرے کھوٹے سکّوں کا ڈھیر تھا۔ لاش کے سرہانے دھوپ جَل رہی تھی۔ ہنومان جی کے پُجاری دُور دُور سے آکر کپڑے پر پیسے ڈال رہے تھے۔ ظہور تمباکو والے نے پورا سو کا نوٹ احتیاط سے بندر کی لاش کے سرہانے رکھا اور

آدب سے دونوں ہاتھ جوڑ کر وہاں سے منھ ہی منھ میں دعائیں پڑھتا ہوا ہٹ گیا۔

افتخار کَسگر اور عارف قلعی گر کی جَلی ہوئی دوکانوں کے سامنے چارپائیاں پڑی تھیں، جن پر پی۔ اے۔ سی۔ کے بہادر جواں بیٹھے تھے۔ ان کی پَگڑیاں اور لوہے کے ٹوپ چارپائیوں کے سرہانے دَھرے تھے، اور وہ خود اس طرح بیٹھے تھے کہ ٹانگوں کے بیچ میں سنگین لگی بندوقیں اور لاٹھیاں کھڑی تھیں۔ پی۔ اے۔ سی۔ کے بہادر جواں مونچھیں مروڑ کر پیتل کے چمکتے گلاسوں میں دودھ اور بادام میں گُھٹی ہوئی بھانگ پی رہے تھے جو پردیش کانگرس کے پردھان شری اَمرت لال گنتھے کے گھر سے برابر بھیجی جا رہی تھی۔

۲

"دو گھس بیٹھئیے مارے گئے؟"

تحسین باجی عرف ثُریّا شہلا ناز نے، جو اردو ادب میں گنگاجَمنی قدروں کی عَلم بردار تھیں، متعجّب ہو کر خود سے سوال کیا۔

تحسین باجی عرف ثُریّا شہلا ناز کو نہ فَساد کا ڈر تھا اور نہ آگ لگنے کا خوف۔ جس دن ہنومان ہتیا ہوئی وہ اطمینان سے بی بی کے حجرے میں حالات کا مشاہدہ کر رہی تھیں، اور ان کے شوہر مزے سے ہندی ساہتیہ گوشٹھی کے کار یالیہ میں بیٹھے اردو "بولی" کی لپی بدلے جانے کے بارے میں کسی نوین وچاردھارا کی چرچا میں مصروف تھے۔

تحسین باجی عرف ثُریّا شہلا ناز بی بی کے حجرے میں محفوظ تھیں۔ یہ حجرہ موکھم چندر کھیم جی کی کوٹھی کا حصّہ تھا جس کی کھڑکیاں سڑک اور گلی دونوں طرف کُھلتی تھیں۔ اس کے باوجود موکھم چندر کھیم جی کی کوٹھی پر کوئی آنچ نہیں آسکتی تھی۔ یکّہ تانگا یونین کے پریشان حال اور تلخ نیتا شریمالی جی کا کہنا تھا کہ "یدی بھگوان سوئم اپنے ہاتھ سے سَنسار کو ناش کرنا چاہیں تو وہ بھی موکھم چندر کھیم جی کی کوٹھی کے بارے میں وچار جرور کریں گے۔"

موکھم چندر کھیم جی کی کوٹھی کا بالائی حصّہ ہوائی جہاز کی شکل کا تھا۔ اگر دو تین میل کی دوری سے دیکھا جاتا تو یہی لگتا جیسے چھت پر کوئی جمبوجٹ کھڑا ہے۔ اس کے نیچے کئی حصّے تھے۔ ایک حصّہ بی بی کا حجرہ کہلاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ موکھم چندر کھیم جی جب چارباغ اسٹیشن کی ریلوے وَرک شاپ میں کام کرتے تھے تو ایک بار اِنجنوں اور مشینوں کے بیچ میں اس طرح پَھنس گئے کہ زندہ بَچنا ناممکن تھا۔ معلوم نہیں کیوں ان کے منھ سے نکلا "یا بی بی سیدہ مدد!" خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بجلی فیل ہو گئی، جس سے ساری مشینیں ٹھپ ہوگئیں، اور موکھم چندر کھیم جی بچ نکلے۔ ذرا سی خراش بھی تو نہ آئی۔ اس کے بعد موکھم چندر کھیم جی کے گھروالوں کو ایسا اعتقاد ہو گیا کہ ان کے دیہانت کے بعد ان کی اولاد نے بھی کوٹھی میں عَلم اور تعزیے رکھنے کی روایت برقرار رکھی۔ کوٹھی کا ایک حصّہ اس کے لئے وقف رہتا، اور اس حصّے کو جسے بی بی کے حجرے کا نام دیا گیا،

ایک کھرے سیّد گھرانے کے لئے وقف کردیا گیا۔ آج کل اس امام باڑہ نما حجرے میں تحسین باجی عرف ثُریّا شہلا ناز مقیم تھیں، جن کو نان نفقہ چھوڑ کر پانداں اور میوہ خوری کے لئے دو سو روپے نقد سیٹھ جی کے ذاتی اخراجات کی مَد سے ملتے۔

تو جب آکاش وانی نے راشٹریہ سماچار میں گھوشنا کی کہ دو پاکستانی گُھس بیٹھئیے مارے گئے تو تحسین باجی عرف ثُریّا شہلا ناز اپنی گنگاجَمنی تہذیب اور قومی یکجہتی کی اونچی لَے کے باوجود ذرا سوچ میں پَڑ گئیں۔ فساد کا تماشا دیکھتے ہوئے اُنھوں نے خود گِنا تھا۔ گیارہ مُردے تو صرف ایک ٹرک میں ڈالے گئے تھے۔ وہ سب پاکستانی گُھس بیٹھئیے تھے کیوں‌کہ سب کے نچلے بدن ننگے تھے اور ایک مُردے کی ننگی ٹانگوں پر کالے پڑتے ہوئے بھورے خون کے ساتھ پتلا پتلا گو بھی جَما ہوا تھا۔ شاید اس گُھس بیٹھئیے پر جام شہادت پیتے وقت اللہ کا خوف بھی طاری ہوگیا تھا۔

فساد کی لبڑ دھوں دھوں، کالے کالے دھوئیں کے مرغولوں، اور مارا ماری کے ہنگامے میں کسی کا بھی دھیان بی بی کے حجرے کی طرف نہیں گیا جہاں تحسین باجی عرف ثُریّا شہلا ناز گِن رہی تھیں؛ ایک ... دو ... تین ...

گیارہ تک کی گِنتی تو ان کو یاد تھی۔ کتنے لوگ زخمی ہوئے تھے اور ان کا کیا حشر ہوا اس بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

تحسین باجی عرف ثُریّا شہلا ناز سوچ رہی تھیں تو یہ کہ وہ جب اس فَساد کے بارے میں کہانی لکھیں گی تو کیسے؟ گیارہ پاکستانی گُھس بیٹھیوں کی لاشیں تو اُنھوں نے خود گِنی تھیں۔ اس کے مقابلے میں دیش سیوکوں کی ایک بھی آرتھی نہیں اُٹھی تھی۔ صرف ایک دُرگا تنبولی کا بیٹا شاردا ہی بری طرح گھائل ہوا تھا۔ جب تک گُھس بیٹھیوں کے ہاتھوں دیش سیوکوں کی بپتا کا حال اچّھی طرح نہ بیان کیا جائے، کہانی میں "بیلینس" نہیں پیدا ہوگا۔ ہندی ساہتیہ کاروں اور اُپنّیاس لکھنے والوں کو اگر اس توازن، معاف کیجیے، "بیلینس" کا خیال نہ ہو تو نہ سہی، پر اردو کہانی میں جب تک یہ "بیلینس" نہو، اس کو نہ تو گنگاجَمنی تہذیب مانا جا ئےگا اور نہ ترقّی پسندی کی سَند مل سکے گی۔

سوچتے سوچتے تحسین باجی عرف ثُریّا شہلا ناز اس نتیجے پر پہنچیں کہ اتنے بڑے فَساد کے بارے میں ایک کہانی لکھنے سے کام نہیں چلے گا۔ اس کے بارے میں تو پورا ناول لکھنا چاہیے؛ اس میں پھر اچّھی طرح توازن، معاف کیجیے گا، "بیلینس" کردیا جائے گا۔

سوتنتر دیش کے سمپادک شری کملیش مشر نے فَساد پر تبصرہ کرتے ہوئے سُناروں کے لڑکوں کی کڑی آلوچنا کی کہ اُنھوں نے بیچ گلی میں لنگوری بندر پال کر شریفوں کی آمدورفت دشوار کردی تھی۔ شری کملیش مشر نے لکھا کے ہنومان جی تو سَچّائی کا پالن کرنے اور سَچّوں کی مدد کرنے کے لئے آئے تھے۔ اس طرح کی گُنڈاگردی تو ان کا اپمان کرنا ہے۔

شری کملیش مشر کے تبصرے کو پڑھ کر شمشیر سلجوقی ڈِی۔ لِٹ۔ بہت خوش ہو ئے۔ اُنھوں نے شری کملیش مشر کے سپوت شری اکھلیش مشر کو عربی زبان و ادب میں سو

میں سے ایک سو دس اعزازی نمبر دیے۔ اس کے علاوہ ان کو ایک طلائی تمغہ بھی عطا ہوا جس کے بعد قاہرہ کے ہندوستانی سفارت خانے میں شری اکھلیش مشر کی تَقرَری پکّی ہو گئی۔

۳

چاندی والی گلی میں میاں لوگوں کے اندھیرے، پرانے، سیلے، اور بُھربھری مٹّی کی طرح ریزہ ریزہ ہو کر مائلِ انہدام مکانات جب جل چُکے اور مَلبہ صاف کیا جا چکا، اور وہاں نئی بستی بسانے کا ٹھیکہ حکم چند مولی چند بنتھیا کو مل چکا، تو پنڈت کیلاش ناتھ خزاں اور منشی پیارے لال غمزدہ نے تحسین باجی عرف ثُریّا شہلا ناز کے تعاون سے ایک قومی یکجہتی مشاعرے کا انتظام کیا جس میں پاکستان سے سیاسی پناہ کی تلاش میں آئے ہوئے ادیبوں اور شاعروں نے بھرپور حصّہ لیا۔ صدارت مولوی گنگا پرشاد مدنی، فاضلِ دیوبند، نے کی۔ حضرت بے پایاں سمندری نے مرحوم لنگور کی مَوت پر ایک حسرت ناک و اندوہ ناک مرثیہ پڑھا۔ مفتی صبغت اللہ حجازی نے کہا کہ چونکہ سائنس اور انتھروپولوجی کی رُو سے بھی ثابت ہو چکا ہے کہ ہنومان جی انسانوں کے مورثِ اعلیٰ تھے، اس لیے میں نے آج تک جو بھی قرآنِ کریم پڑھا ہے اس کا ثواب مرحوم لنگور کی روح کو بخشتا ہوں۔

پوری محفل جَذبۂ اتّحاد، قومی یکجہتی، اور رواداری کے جذبے سے سرشار ہوگئی۔ پاکستانی ادیبوں اور شاعروں نے حسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "افسوس، ہمارے ملک میں یہ وسیع النظری پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔"

"وہاں تو اسلام بیٹھا ہوا ہے،" سنجیدہ نیازی نے حقارت اور طنز سے آواز بڑھاتے ہوئے کہا، پھر رتن سنگھ ڈھینگرہ کی گود میں بیٹھ کر ڈائرمیکن کی "سولن" منھ سے لگالی۔